اعلانِ بالفور۔۱۹۱۷ء

رضی الدین سید*

ABSTRACT:

Balfour Declaration, an important political document, drafted by the then British Foreign Secretary, Lord Arthur Balfour in 1917 has proved so fatal to the world peace that the entire global community remains constant focus to the threat of war in the Middle East, even of an atomic war. The Declaration indeed was aimed at no more than the help the Jews in grabbing Palestine as their homeland, fomenting the anguish of the worldwide Muslim community, and at reshaping the History and Geography of Middle-East.

The ever proven reality is that the land of Palestine is, and has, remained in the custody of the Arabs for thousands of years, even before the advent of Islam in the region.

Born in a Christian family, Lord Arthur Balfour had his inner sympathies for the Jews only. He belittled the sentiments, emotions, and the legal-cum-political rights of the Muslims at the time of his announcement of Declaration.

It is also noteworthy that primarily African country Uganda was awarded to the Zionists as their homeland in fear of the Arab reaction and wrath. But the idea was absolutely rejected by the then Zionist leaders insisting on to carve it out right in the heart of the Middle East. So viewing its financial harm in the first world war,and hoping to be aided by the great financial Zionist Lords in this respect, the British Government bowed ultimately before the Zionist designs and decided to follow only their guidance. Balfour Declaration is thus the outcome of that conspiracy.

The most notable words stated about Palestine are that it is "a country so small, but has the history so vast", and that "no other piece of land in the world has ever faced as much catastrophy and wars as this small piece of land has!"

لارڈ آرتھر بالفور، برطانیہ کا عیسائی وزیرِخارجہ، جس نے اسرائیل کے قیام کے لیے ۱۹۱۷ میں ایک اہم سرکاری برطانوی دستاویز تیار کی تھی، ایک ایسا کاغذ جس کے باعث مشرقِ وسطیٰ میں امن تب سے اب تک مکمل طور پر درہم برہم ہے۔ دستاویز کے کل الفاظ ویسے تو محض ۶۷ ہیں، لیکن دراصل یہی وہ ۶۷ طاقتور الفاظ ہیں جنھوں نے اس پورے خطے کو گزشتہ ۷۰ سالوں سے آگ وخون میں نہلایا ہوا ہے۔

وزیرِاعظم لائڈ جارج کی حکومت میں وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والا یہ فرد اگرچہ عیسائی تھا، لیکن

* ڈائریکٹر۔ نیشنل اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ، کراچی۔ برقی پتا: national.a.research@gmail.com
تاریخِ موصولہ: ۲۷ستمبر۲۰۱۳ء

اس کے باوجود اس کی ہمدردیاں یہودیوں کے ساتھ زیادہ تھیں۔حالانکہ یہ وہ دور تھا جب کم وبیش ساری مغربی دنیا یہودیوں کی جانی دشمن بنی ہوئی تھی۔صیہونی رہنماؤں، ''چیم ویزمین'' اور ''روتھ شیلڈ'' وغیرہ نے اس پر اور اس وقت کے وزیر اعظم لائڈ جارج پر اس حد تک قابو پالیا تھا کہ انہیں اس امر پر مطلق یکسو کر دیا تھا کہ زمین پر اگر کوئی قوم سب سے زیادہ مظلوم ہے تو وہ یہی یہودی ہے۔انہیں باور کروادیا گیا تھا کہ اس قوم کو سارا یورپ مل کر کچل رہا ہے اور جس کے پاس ہزار سالوں سے کوئی وطن بھی نہیں ہے۔کثیر الاولاد والدین، (آٹھ بیٹے بیٹیوں)، کے گھر جولائی ۱۸۴۸ میں جنم لینے والے اس شخص نے ۸۲ سال کی عمر پانے کے بعد جولائی ۱۹۴۸ میں وفات پائی تھی۔(اس دور میں عیسائیوں کے ہاں جنم لینے والے بچوں کی تعداد پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی)

جولائی ۱۹۰۲ تا دسمبر ۱۹۰۵ کے عرصے میں وہ برطانیہ کا وزیر اعظم بھی رہ چکا تھا۔لیکن ۱۹۱۰ کے انتخابات میں بہر حال وہ اپنی نشست ہار گیا تھا۔بعد میں وزیر اعظم لائڈ جارج کی حکومت میں اسے وزیر خارجہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے لیے منتخب کیا گیا۔

فلسطین میں ''بے گھر'' یہودیوں کے لیے ایک وطن کے قیام کے لیے صیہونی اگرچہ بہت پہلے سے متحرک ہو چکے تھے، اور اس سلسلے میں انہوں نے جنوری ۱۹۱۵ میں اس وقت کے وزیر اعظم 'لارڈ ایسکوئیتھ' کو یاددہانی کا ایک نوٹ بھی تحریر کیا تھا، تاہم وزیر اعظم ایسکوئیتھ یہودیوں کی اس تجویز سے متفق نہیں تھا۔عیسائیوں میں اس دور تک یہودیوں کے خلاف ان کی جانب سے اپنے پیغمبر کے بارے میں کی گئی گستاخی کے ردعمل میں انتقام کا جذبہ بڑی حد تک موجود تھا۔(اب ان کا یہ جذبہ بہر حال سرد پڑ چکا ہے)۔لارڈ ایسکوئیتھ نے اس بارے میں اپنی ڈائری میں لکھا کہ ''میں نے ابھی ابھی 'ہربرٹ سیموئیل' کی جانب سے ایک یاددہانی نوٹ بعنوان 'فلسطین کا مستقبل' وصول کیا ہے۔سیموئیل کا کہنا ہے کہ 'اس خطے میں تیس سے چالیس لاکھ یہودیوں کو داخل کر دینا ایک اچھا اقدام ہوگا'۔(تاہم) میں اقرار کرتا ہوں کہ ہماری ذمے داریوں میں اس نئے اضافے نے مجھے زیادہ متأثر نہیں کیا ہے''۔قابلِ غور بات یہ ہے کہ مذکورہ 'ہربرٹ سیموئیل' برطانوی کابینہ کا ایک یہودی وزیر تھا۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس دور میں اپنے وطن کے قیام کے لیے تمام اہم یہودی رہنما متفق ومتحرک ہو چکے تھے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کی جانب سے صیہونیوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔چنانچہ انہوں نے طے کر لیا کہ اس 'نامعقول' وزیرِ اعظم کو اس کے عہدے سے برطرف کروادیا جائے۔اور واقعی انہوں نے ایسا ہی کیا۔۱۹۱۶ میں انہوں نے اسے برطرف کروا کے دم لیا جس کے بعد صیہونیوں کے ہمدرد 'لائڈ جارج' نے ملک کی حکومت سنبھالی۔

یہی وہ دور تھا جب دنیا میں پہلی عالمی جنگ برپا ہوئی تھی اور برطانیہ اس بات کا شدید خواہشمند تھا کہ امریکہ بھی اس جنگ میں ایک اتحادی بن کر حصہ لے۔برطانیہ کو اندازہ ہوا کہ فلسطین میں یہودیوں کے لیے اگر کوئی وطن علیحدہ سے قائم کر دیا جائے تو تمام عالمی یہودی برادری برطانیہ کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے گی اور نتیجے میں امریکی یہودی بھی اپنی

حکومت پر دباؤ بڑھا دیں گے۔ برطانیہ اس جنگ میں ہر یورپی ملک کے یہودیوں کی حمایت کا طلب گار تھا کیونکہ وہ اس بڑی اور طویل جنگ کا خرچہ برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا جبکہ یہودی انہیں مسلسل بھاری قرضوں کی پیشکش بھی کر رہے تھے۔ دوسری جانب یہودیوں کی کلی و اجتماعی عالمی ہمدردیاں بھی برطانیہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھیں۔ ادھر یہودیوں کے حد درجہ دباؤ پر برطانوی حکومت خود بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ یہودیوں کی تعذیب اور انہیں کھدیڑے جانے کا الزام چونکہ تمام تر مغرب پر ہی آتا ہے، اس لیے ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی حل مغرب ہی کو نکالنا چاہیے۔ یہودیوں کے مقاصد کی خاطر بطور وزیر خارجہ لارڈ بالفور کو اہم یہودی مرکزی شخصیت 'روتھ شیلڈ' نے، جس نے یہودی وطن کے قیام کو اب اپنا خصوصی مقصد قرار دے لیا تھا، ۱۸ جولائی ۱۹۱۷ کو مندرجہ ذیل خط تحریر کیا۔

عزیز مسٹر بالفور۔ آخر کار اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ آپ کو آپ کا مطلوبہ فارمولہ روانہ کر سکوں۔ اگر ہز میجسٹی (شاہِ برطانیہ) کی حکومت اس فارمولے کے ساتھ مجھے ایک مطابقتی پیغام بھی روانہ کر دے، اور اس (فارمولے) کو وہ اور آپ دونوں منظور کر لیں، تو ایک میٹنگ میں مَیں اسے صیہونی فیڈریشن کے حوالے کر دوں گا۔

چنانچہ صیہونیوں کی کوششیں رنگ لائیں اور ۹ نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانوی حکومت کی جانب سے اس تاریخی دستاویز کا اجرا ہوا جس نے مسلم فلسطین کے عین قلب میں دھونس اور دھاندلی والی ایک یہودی ریاست کی داغ بیل ڈال دی۔ دستاویز مذکورہ کے الفاظ، جسے ''اعلانِ بالفور'' (Lord Balfour Declaration) کا نام دیا گیا تھا، یہ ہیں۔

> شاہِ معظم کی حکومت، یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن کی خاطر، فلسطین میں ایک ریاست کے قیام کا اعلان کرتی ہے۔ تاہم یہ بات بہت واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ (اس کی وجہ سے) پہلے سے موجود غیر یہودی فلسطینی طبقوں کے مذہبی اور شہری حقوق کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جا سکے گا۔

توجہ کے قابل نکتہ یہ ہے کہ اعلان میں عیاری کے ساتھ فلسطینیوں کے سیاسی حقوق کا ذکر گول کر دیا گیا تھا۔ یہ اعلان جو پہلے محض ایک خط تھا، اور یہودی رہنما 'روتھ شیلڈ' کو لکھا گیا تھا، اسے ایک ہفتے کے بعد ۹ نومبر ۱۹۱۷ کو اشاعت کے لیے پریس میں دئے جانے کے بعد ''اعلانِ بالفور'' کے سرکاری نام سے پکارا جانے لگا۔ یاد رہنا چاہیے کہ اس سے قبل فلسطین عرصہ دراز سے عثمانی خلافت کے صوبے ''شام'' کا ایک حصہ چلا آ رہا تھا۔ آخری عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی کو بھی اولین صیہونی رہنما 'تھیوڈور ہرزل' نے فلسطین بخشے جانے کے عوض کئی لاکھ پاؤنڈ عطیہ (یا رشوت) دینے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن خلیفہ نے اسے جو جواب دیا تھا، اور جو حیرت کی حد تک جرأت مندانہ ہے، تاریخ نے اسے بھی ریکارڈ میں محفوظ رکھا ہے۔ خلیفہ نے کہا تھا کہ ''فلسطین کو اس کی لاش پر سے گزر کر ہی اس سے حاصل کیا جا سکتا ہے''(۱)۔ غور کرنا چاہیے کہ اُس دور کے ترکی کے کمزور معاشی و سیاسی حالات، اور خود خلیفہ کے سازشوں میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود، خلیفہ کا جواب کس قدر مومنانہ و جرائت مندانہ تھا!

مذکورہ اعلان میں یہودیوں کے لیے تو ایک ''سیاسی ریاست'' کی خوشخبری سنادی گئی تھی لیکن قدیم و دیرینہ مسلم باشندوں کے لیے سیاسی کے بجائے محض ''مذہبی اور شہری حقوق'' کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا۔ظاہر ہے کہ عربوں کے لیے یہ محض اشک شوئی کا ایک جملہ تھا۔خطے میں صورتِ حال پہلے ہی سے یہ تھی کہ یہودی جہاز بھر بھر کے فلسطین پہنچ رہے تھے اور عرب فلسطینیوں کو علاقے سے یا تو جبراً باہر نکال رہے تھے، یا پھر اونے پونے داموں زمین خرید کر انہیں وہاں سے بے دخل کر رہے تھے(۲)۔ظاہر ہے کہ اس کے بعد دو متضاد قوموں میں فطری طور پر سدا کے لیے فساد اور خون خرابہ تو برپا ہونا ہی تھا!

اس موقعے پر امریکی مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ لکھتی ہے کہ ''برطانیہ ایک طویل عرصے سے یہودیوں کی فلسطین کی جانب واپسی کے خواب کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔۱۹۱۷ میں جنگِ عظیم اول کے دوران برطانیہ نے اپنے اس عمل کو ایک عسکری حکمت عملی کے طور پر بھی ترجیح دی تھی''۔مصنفہ لکھتی ہے کہ اعلانِ بالفور اگرچہ کر تو دیا گیا تھا لیکن (حیرت انگیز طور پر) عربوں کو اس سے سرکاری طور پر مطلع نہیں کیا گیا تھا۔تاہم راز کسی اور انداز سے طشت از بام ہوا۔کیونکہ سرکاری دستاویزات میں انگریزی و عربی کے ساتھ ساتھ عبرانی زبان کا استعمال بھی یکا یک شروع کر دیا گیا تھا جبکہ اُدھر انتظامیہ میں بھی یہودی بیوروکریٹس کا مزید اضافہ کیا جا رہا تھا۔ادھر'لیگ آف نیشنز' کا آرٹیکل ۲۲ اصرار کرتا تھا کہ ''برطانیہ (فلسطین کے) عوام کی فلاح و بہبود اور ترقی کو تہذیبِ انسانی کا مقدس فریضہ سمجھ کر ادا کرے''۔لیکن اُدھر برطانیہ تھا کہ اسے یہاں یہودیوں کے لیے ایک قومی ریاست قائم کرنے کی راہ ہموار کرنے کی فکر پڑی ہوئی تھی۔(۳)

یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عرب ممالک کے درمیان اسرائیل کے قیام پر مغربی طاقتوں کو جن مختلف وجوہ نے ابھارا تھا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جنگِ عظیم اول میں ترکی نے جرمنی (ہٹلر) کے ساتھ اتحاد کر کے دیگر مخالف اتحادی قوتوں کے ساتھ جنگ کی تھی۔اس وقت کا برطانوی وزیرِاعظم ''چرچل''، جرمنی کے چانسلر ''ہٹلر'' کا بدترین دشمن تھا۔اس لیے چرچل نے ترکی کے حصے بخرے کرنے میں اس انتقام کی خاطر بھی خوب دلچسپی دکھائی تھی۔دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ یہ علاقہ مصر اور نہر سوئیز پر کنٹرول کے لیے دونوں علاقوں سے قریب ترین ہے، اور عراق سے تیل کی برآمدگی اردن (فلسطین) ہی کے راستے سے ممکن تھی۔

ریاستِ اسرائیل کے قیام کے سلسلے مین دو اہم رہنماؤں کے درمیان ایک اہم مکالمہ بھی تاریخ کا ایک دلچسپ حصہ ہے۔

(ا)۱۹۰۶ میں برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بالفور اور تحریک صیہونیت کے بانی چیم وائزمین کے درمیان لندن میں ایک ملاقات ہوئی جس میں گفتگو کا اہم ایجنڈا اسرائیل کا قیام ہی تھا۔بالفور نے چیم وائزمین سے سوال کیا کہ اگر یہودیوں کو یوگنڈا (افریقہ) کا ملک بطور یہودی ریاست دے دیا جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟۔چیم نے جواب دیا کہ اگر میں اس سوال کا جواب اس طرح دوں کہ اگر آپ کو لندن کی بجائے پیرس کا شہر دے دیا جائے تو کیا اس سے آپ کو کوئی حرج ہوگا؟۔بالفور نے جواب دیا کہ ''مگر لندن تو پہلے ہی سے ہمارا وطن ہے''۔ویزمین نے جواب دیا کہ ''اسی طرح فلسطین بھی

ہمارا وطن ہے''۔ بالفور نے دوسرا سوال کیا کہ کیا دوسرے یہودی بھی تمہاری مانند سوچ رکھتے ہیں؟۔تو ویز مین نے جواب دیا کہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ان لاکھوں یہودیوں کی زبان بول رہا ہوں جن سے آپ ملے تک نہیں ہیں اور جو آپ تک اپنی آواز بھی نہیں پہنچا سکتے۔اس پر بالفور نے جواب دیا کہ ''اگر ایسی بات ہے تو پھر ایک دن تم (تمہاری قوم) ضرور ایک بڑی قوت بن جائے گی''۔

(۲) نومسلم، سابق یہودی مصنف، مفکر، قرآن پاک کے انگریزی مترجم، اور سابق سفارت کار پاکستان، علامہ لیو پولڈ محمد اسد، جو اعلان بالفور کے وقت حیات تھے اور جنہیں صیہونیوں کی اس حرکت سے کراہیت تھی، چیم ویزمین اسرائیل کے اولین صدر، سے اپنی ایک ذاتی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ قیامِ اسرائیل سے قبل جب میں نے اس سے سوال کیا کہ ''ایک ایسے خطے میں جہاں عرب بھاری اکثریت میں ہیں، اور جو نئی یہودی ریاست کے تصور پر سخت مشتعل ہیں، تم اسے اپنا وطن کن بنیادوں پر بنا سکتے ہو؟''، تو اس صیہونی شخصیت نے کندھے اچکاتے ہوئے مجھے جواب دیا کہ ''میرے خیال میں چند برسوں کے اندر اندر ہی عرب اس خطے میں اپنی اکثریت کھو دیں گے''۔اس کے منہ سے یہ جواب سن کر محمد اسد حیران رہ گئے۔تاہم انہوں نے پھر سوال کیا کہ معاملے کی سیاسی حیثیت سے ہٹ کر بھی میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اخلاقی طور پر بھی یہ اقدام تمہارے لیے درست ہے کہ ایک جمی جمائی قوم کو تم اٹھا کر باہر پھینک دو اور خود آ کر یہاں مقیم ہو جاؤ؟۔محمد اسد کہتے ہیں کہ اس سوال پر چیم ویزمین نے ایک بار پھر رکھائی سے جواب دیا کہ ''اصل میں یہ وطن ہمارا ہی ہے اور ہم بس اپنا حق ہی وصول کر رہے ہیں''۔اس کے بعد اس شخص نے اپنی گفتگو کا رخ کسی اور جانب پھیر دیا۔ علامہ لیو پولڈ اسد تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ قوم جو سدا سے قتل، عذاب، اور دربدری کی سزائیں بھگتتی رہی ہے وہ اپنی ساری وحشیانہ حرکتیں اب خود عرب قوم کے ساتھ دہرا رہی ہے!۔اور وہ بھی ایک ایسی قوم کے ساتھ جس کا یہودیوں کی جلاوطنی، دربدری، عذاب، اجتماعی قتل، اور نحوست سے کوئی تعلق نہیں ہے!''۔(۴)

ادھر چونکہ عثمانی خلافت کے حجاز کے عربی گورنر شریف حسین نے انگریزوں کے کہنے پر ترکوں کے خلاف سرعام بغاوت کر دی تھی، اس لیے اعلانِ بالفور پر عرب جو ہنگامہ آرائی کر رہے تھے، انگریزوں کا ساتھ دیتے، اور اپنے مفادات کا لحاظ رکھتے ہوئے شریف حسین نے عربوں سے یہودیوں کی مخالفت ترک کر دینے کی اپیل کی۔اس نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ فلسطین میں یہودیوں کی آمد سے وہ خوفزدہ نہ ہوں کیونکہ وہ ان کے بھائی ہی ہیں۔اور ان کی آمد سے علاقے کو مل جل کر ترقی حاصل ہوگی۔لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ یہودی چالوں کو سمجھ نہیں سکا تھا۔اس (شریف حسین) سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کی مجوزہ آزاد عرب ریاست میں فلسطین بھی شامل ہوگا۔تاہم اس وقت اسے سخت دھچکا پہنچا جب ۱۹۱۸ میں برطانیہ نے اپنے ایک کمانڈر کو شریف حسین کے پاس بھیجا اور آگاہ کیا کہ مجوزہ آزاد ریاست میں فلسطین شامل نہیں ہے۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شروع ہی سے انگریزوں کی نیت فلسطین کو محض یہودیوں کے لیے مختص کئے جانے کی تھی۔تاہم شریف

حسین کی ''خدمات'' کا لحاظ کرتے ہوئے اسے ایک طرف شام کا، اور دوسری طرف فلسطین کا کچھ حصہ ملا جلا کر اردن کے نام سے ہبہ کیا گیا(۵)۔ آجکل جو حکمران اردن میں بادشاہت کر رہے ہیں، وہ دراصل اسی شریف حسین کی اولاد ہیں۔

اس دور کی قائم شدہ ''لیگ آف نیشنز'' نے ۱۹۱۹ میں ایک سرکاری کمیشن تشکیل دے کر اسے عرب علاقوں کی جانب روانہ کیا تا کہ عربوں کی بے چینی کا اصل سبب وہ بذاتِ خود دریافت کر سکے۔ طویل ملاقاتوں اور جائزوں کے بعد کمیشن نے جو رپورٹ شائع کی تھی، وہ بہت حقیقت پسندانہ تھی اور اس میں بالکل درست انداز سے سفارش کی گئی تھی کہ زیرِ غور اعلانِ بالفور پر عمل درآمد نہ کیا جائے بلکہ اس کے بدلے فلسطین اور شام کا ادغام کر کے ایک نئی متحدہ عرب ریاست (United Arab State) کے نام سے قائم کی جائے۔ رپورٹ میں یہ بھی تجویز دی گئی تھی کہ ''صیہونی لیڈران اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے فلسطین کی بجائے کسی اور سرزمین کا انتخاب کریں'' (۶)۔ اس ضمن میں امریکی مصنف ''رون ڈیوڈ'' کہتا ہے کہ کمیشن کے ارکان نے وہاں موجود جس بھی برطانوی افسر سے اس بارے میں رائے لی، سب نے متفقہ طور پر یہی رائے دی کہ صیہونی منصوبہ سوائے طاقت کے، کسی اور طریقے سے تکمیل نہیں پا سکتا۔ یہودی نمائندوں کے ساتھ کنگ کرین کمیشن کے کمشنر حضرات کی کانفرنسوں میں یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آئی کہ فلسطین میں صیہونی، غیر یہودی آبادی کا مکمل صفایا چاہتے ہیں (۷)۔ تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ خود ''لیگ آف نیشنز'' کی تشکیل کردہ اس کمیشن کی رپورٹ کو کسی بھی مغربی قوت نے پرِ کاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دی۔ مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ تبصرہ کرتی ہے کہ ''پھر جب 'لیگ کے اجلاس میں دستاویز پر غور و خوض کا وقت آیا تو امریکی صدر 'ووڈرولسن' نے اپنی ترجیحات بالکل ہی بدل ڈالیں۔ چنانچہ بڑی محنت سے تیار کردہ اس سرکاری رپورٹ کو بالآخر سرد خانے ہی کی نذر کرنا پڑا'' (۸)۔ ۱۹۱۴ میں پیرس میں ایک صیہونی اجتماع میں چیم ویزمین نے فلسطین پر قبضے کے لیے ایک جاذبِ توجہ نعرہ سامعین کے سامنے پیش کیا۔ اس نے کہا کہ ''ایک ملک جس کی کوئی قوم نہیں ہے، ایک ایسی قوم کے لیے جس کا کوئی ملک نہیں ہے!''۔ مصنف رون ڈیوڈ کہتا ہے کہ نعرے سے متأثر ہو کر یہودی جب ہجرت کر کے فلسطین پہنچنے لگے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں تو ایک قوم پہلے ہی سے رہ بس رہی ہے۔ (۹)

یو این او نے تقسیمِ فلسطین کی تاریخ ۱۹۴۷-۱۱-۹ رکھی تھی لیکن عربوں نے اسے برداشت نہیں کیا اور شدید ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ چنانچہ سرکاری طور پر اس تقسیم کو مؤخر کر دیا گیا۔ تنگ آ کر اسرائیلی بڑوں نے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ کو ایک نئی آزاد ریاست کی آزادی کا از خود اعلان کر دیا جسے حیرت انگیز طور پر تمام بڑی قوتوں نے تسلیم کر لیا۔ حالانکہ ان کی جانب سے اسرائیلی رہنماؤں کی سخت گرفت کی جانی چاہیے تھی۔ اس وقت تک اسرائیلی خطے میں ۵۰،۰۰۰ مسلح یہودیوں کو منظم کیا جا چکا تھا جبکہ برطانوی آشیر باد کے باعث یورپی ممالک سے ہزاروں یہودیوں کی آمد بھی مسلسل جاری تھی۔ اپنی اس ہجرت کو وہ ''عالیہ'' کے تقدس والے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ قیامِ اسرائیل کے بعد چیمز وائز مین کو جو ایک کیمیکل سائنسدان تھا، ملک کا پہلا صدر اور ڈیوڈ بن گوریان کو پہلا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

اعلانِ بالفور سے ایک طرف اگر یہودیوں کو بڑی شہہ مل رہی تھی تو دوسری جانب عربوں کو اس کے باعث برطانیہ سے شدید دھچکا بھی پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ پورے عرب علاقے، خصوصاً فلسطین میں، مغربی طاقتوں کے خلاف شدید قسم کے خونی مظاہرے شروع ہوگئے جو بڑھتے بڑھتے اس قدر شدید ہوگئے کہ برطانیہ خود بھی ان سے پریشان ہوگیا۔ واضح رہے کہ فلسطین کے عیسائی بھی یہودیوں کی آبادی اور قبضے کے قطعی خلاف تھے اور مظاہروں میں عربوں کے ساتھ وہ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ آخر مجبور ہوکر برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ مشرقِ وسطیٰ میں کسی یہودی ریاست کی تشکیل اب اس کی پالیسی کا حصہ نہیں رہا ہے۔ ۱۹۱۸ کو عرب فلسطینی نمائندہ شخصیات کے ایک وفد نے برطانوی حکومت کو یادداشت پیش کی کہ انہیں یہودیوں پر توڑے جانے والے یوروپی تشدد پر انتہائی دکھ ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انہیں ہمارے ملک پر قابض کردیا جائے اور وہ الٹا ہم ہی پر حکمرانی کرنے لگ جائیں۔ اس وقت برطانیہ عجیب کشمکش میں آگیا تھا۔ ادھر یہودیوں کا دباؤ تھا کہ مسلسل بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔ چنانچہ برطانیہ پھر اپنے وعدے کا پاس نہ رکھ سکا۔ اسی وجہ سے عرب بھی پھر یہی سمجھنے لگے کہ فلسطین کے لیے انہیں چاہے جس قسم کی بھی ضمانت دے دی جائے، صیہونی شخصیات لندن میں کسی کا بھی ہاتھ مڑور کران ضمانتوں کو منسوخ کروالیں گی۔ (۱۰)

فورڈ کار کا بانی صنعتکار ہینری فورڈ، جسے یہودیوں کی فطرت کا خوب پتا تھا، لکھتا ہے کہ ''اگر دنیا کو یہ معلوم ہوجائے کہ یہودیوں نے فلسطین میں عربوں سے کس طرح زمین ہتھیائی ہے، تو ان کے دل یہودیوں کے خلاف نفرت سے بھر جائیں''۔ (۱۱)

اسی دوران فلسطین میں ۱۹۲۲ کی محض ۱۱ فیصد یہودی آبادی کے مقابلے میں ۱۹۴۸ میں یہ تعداد ۳۱ فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ اعلان بالفور کے وقت مقامی عرب ۹۰ فیصد کی تعداد میں آباد تھے جبکہ یہودیوں کی آبادی اس وقت محض ۵۰،۰۰۰ ہزار تھی۔ لیکن اسرائیل کی آزادی کے ایام ۱۹۴۷ میں یہودیوں کی تعداد بڑھ کر چھ لاکھ ہوچکی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ میں جبکہ فلسطین میں ابھی برطانوی انتداب (Mandate) جاری تھا، عرب مظاہروں اور مخالفتوں کے جواب میں یوروپی یہودیوں نے صاف صاف اعلان کردیا کہ وہ پورے فلسطین کو اپنا وطن بنائے بغیر نہیں رہ سکتے (۱۲)۔ برطانیہ پر صیہونیوں کا دباؤ اس قدر زیادہ تھا کہ نئی عالمی تنظیم ''ادارہ اقوام متحدہ'' نے اپنے قیام کے بعد ۱۹۴۲ میں ان کے دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہوئے برطانیہ کو فلسطین سے واپس بلالیا اور علاقے کو یہودی اور مسلم دو علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں از خود تقسیم کرکے یروشلم کو ایک بین الاقوامی شہر قرار دے دیا۔ فلسطینی افراد کی کل آبادی کا یہودی اگرچہ محض ایک تہائی حصہ ہی تھے لیکن انہیں خطے کا ۵۶ فیصد حصہ بخش دیا گیا۔ بیرونی ممالک سے تیز رفتار ہجرت کے باعث یہودیوں نے آبادی کے معاملے میں مسلمانوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ادھر یہودی جہاز بھر بھر کے فلسطین پہنچ رہے تھے اور ادھر فلسطینی کثیر تعداد میں اپنے آبائی وطن سے باہر نکالے جارہے تھے۔

مصنفہ کیرن آرمسٹرانگ بجا طور پر اپنی ایک دوسری کتاب ''مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال'' میں کہتی ہے کہ ''مغربی

طاقتوں کے ہاتھوں فلسطین کا چھینا جانا اسلامی دنیا کی تذلیل کی ایک علامت بن گیا۔مغرب کا ضمیر لاکھوں فلسطینیوں کی مستقل بے وطنی پر ذرا بھی ملامت کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا''۔(۱۳)

علامہ لیو پولڈ محمد اسد نے اس موضوع پر بہت عمدگی کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔اپنی معروف کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' میں وہ بیان کرتے ہیں کہ اعلانِ بالفور کے نتیجے میں جو یہودی فلسطین پہنچ رہے تھے،ان کا جذبہ یہ نہیں تھا کہ وہ کسی اپنے وطن کی طرف واپس جارہے ہیں۔ بلکہ یہ تھا کہ یورپی سازشوں اور منصوبوں کے تحت جو اجنبی ملک انہیں بخشا جارہا ہے،اسے وہ ''آخرکار اپنا وطن بنا کر ہی دم لیں گے''۔وہ کہتے ہیں کہ یہ اعلان دراصل نوآبادیات جنم دینے والی قوتوں کا وہی پرانا طریقہ اور دستورِ عمل تھا کہ ''قوموں کو تقسیم کرو اور پھر مزے سے حکومت کرو''۔ برطانیہ کا یہ قدم اس پختہ معاہدے کی بھی صریح خلاف ورزی تھا جو اس نے ترک خلافت سے نجات کی خاطر مملکت کے عرب گورنر مکہ ''شریف حسین'' سے کیا تھا کہ خطے میں وہ ایک ''آزاد'' عرب ریاست قائم کرے گا۔ برطانیہ نے نہ صرف یہ کہ اس معاہدے کے ساتھ بددیانتی کی بلکہ الٹا غضب یہ بھی کیا کہ زمانہء لامحدود سے آباد فلسطینیوں کو بھی اس سرزمین سے نکال باہر کیا۔(۱۴)

مذکورہ اعلان سے متعلق ایک اہم حقیقت یہ بھی ہم سب کے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس میں بعض ابہامات پائے جاتے ہیں جنہیں حکومتِ برطانیہ کے ذمے داروں نے عرب آبادی کو زیادہ مشتعل نہ کرنے کی خاطر جان بوجھ کر رہنے دیا تھا۔مثلاً یہ لکھنے کی بجائے کہ ''فلسطین جو دراصل یہودیوں کا اصل وموعودہ وطن ہے،وہ انہیں عطا کر دیا جائے گا''، یہ لکھا گیا کہ ''فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کی تشکیل کا اعلان کیا جاتا ہے''۔اس کی وجہ وہی عربوں کی جانب سے برطانویوں کی مخالفت کا خوف تھا۔

کیرن آرمسٹرانگ کہتی ہے کہ ۱۹۲۰ میں برطانوی دور میں یروشلم میں ایک عبرانی یونیورسٹی کے افتتاح کا دن تھا۔ تقریب کی صدارت کے لیے لندن سے لارڈ بالفور کو بطورِ خاص بلوایا گیا تھا۔تقریب کے دوران شدتِ جذبات سے اس کے آنسو بہتے رہے جنہیں چھپانے کی اس نے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔لیکن دوسری جانب اس موقع پر یروشلم کی گلیاں اور بازار سراپا احتجاج تھے۔سوق (بازار) میں خاموشی طاری تھی۔لیکن بالفور کو اس کی کوئی پروا بھی نہیں تھی۔

فلسطین کی واگزاری اور اسے یہودیوں سے پاک کرنے کی تیس سالہ جدوجہد میں مفتیءاعظم فلسطین محترم امین الحسینی مرحوم کی جدوجہد کو ہرگز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ پوری فلسطینی قوم اس دور میں ان کے پیچھے متحد تھی۔صیہونیت کے خلاف ان کا رویہ تاعمر غیر لچکدار اور غیر مصالحت پسندانہ ہی رہا۔

یہ بھی بہرحال ایک اہم حقیقت ہے کہ فلسطین میں اگر مسلمانوں کی بجائے عیسائیوں کی اکثریت ہوتی تو برطانیہ اور دیگر مغربی قوتیں خطے کو کبھی اسرائیل میں تبدیل نہ ہونے دیتیں۔کون نہیں جانتا کہ مشرقِ وسطیٰ میں خصوصاً،اور تمام دنیا میں عموماً،امن کو تارتار کردینے میں اسی اعلانِ بالفور کا کردار ہے جس کے پیچھے برطانیہ اور امریکہ دونوں طاقتوں کے مفادات

شامل تھے! ۔مسلمانوں کو معلوم رہنا چاہیے کہ سازشوں میں ان کے خلاف کون کون سی طاقتیں اور کون کون سی شخصیات شامل رہتی ہیں اووہ کس قدر گہری اور ہمہ پہلو سازشیں کرتی ہیں؟

مراجع وحواشی

(۱) مودودی،مولانا،کتابچہ القدس،ص ۱۵،کراچی،اسلامک ریسرچ اکیڈمی،۲۰۰۳

۔ شہابی،فیض احمد،مشرقی یورپ میں مسلمانوں کا عروج وزوال،ص:۷۰،لاہور،ادارہ معارفِ اسلامی،۱۹۹۱

(۲) کولئیرز انسائی کلوپیڈیا،جلد:۱۳،ص:۳۴۲۔۳۴۱،امریکا

(۳) آرمسٹرانگ،کیرن،یروشلم:ایک شہر،تین مذاہب،صفحہ:۵۷۵۔۵۷۴،لاہور،تخلیقات،۲۰۰۷(مترجم:طاہر منصور فاروقی)

(۴) اسد،محمد،Road to Mecca،باب:Winds،دارالاندلس،۱۹۸۵

(۵) ڈیوڈ،رون،قومیں جو دھوکا دیتی رہیں،ص:۸۳،کراچی،نیشنل اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ

۔ فلپ اور ہٹی،History of the Arabs،ص:۷۵۵،لندن،بالگریو مک ملن،۲۰۱۰

(۶) ایضاً،ص:۵۷۶ (۷) ایضاً،ص:۵۸ (۸) ایضاً،ص:۵۷۶

(۹) ڈیوڈ،رون،ایضاً،ص:۶۲ (۱۰) ایضاً،ص:۶۵

(۱۱) میاں،عبدالرشید،The International Jew،ص:۶۰،لاہور،صفہ پبلشرز،۲۰۰۳ء

(۱۲) ایضاً،ص:۸۲۹ (۱۳) ایضاً،ص:۱۶۶ (۱۴) ایضاً،ص:۵۷۸